اسلام اور آزادی

از

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی قدس اللہ سرہ

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند
دسمبر 1953ء

اسلام اور آزادی!

(مولٰنا محمد طیب صاحب مدظلہ)

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

اسلام آزادی کا سب سے بڑا حامی اور علمبردار ہی نہیں بلکہ وہی اور صرف وہی حقیقی جامع اور مکمل آزادی کا پیغام لے کر دُنیا میں آیا ہے، اگر دُنیا اسلام سے رُوشناس نہوتی تو آزادی کا کوئی مفہوم ذہنوں میں اور اُس کا کوئی عملی نقشہ آنکھوں میں نہ سما سکتا۔ کیونکہ عقل کی تگ تاز کی حد تک آزادی کے معنی کوٹھی بنگلہ۔ کیک پسٹری۔ توس، مکھن، کھیل تماشہ۔ گانا بجانا۔ آلات لہو ولعب نفسانی عیش و نشاط۔ ملکوں میں آمد و رفت۔ ہوائی یا بری وبحری سیر و سیاحت، پارٹی فیلنگ اور اُس سے حریفوں کی شکست۔ استعمار اور جوع الارض مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر وضع قانون، اور قانونی داؤ و پیچ کے پردوں میں اقوام و طبقات کو بے بس اور بے حق ٹھیرا دینے کے نہیں ہیں۔ ورنہ غلامی اور غلام سازی کے لفظ کے لئے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے۔ بلکہ آزادی کے معنی حق و صداقت، عدل و انصاف، اور ایثار و رواداری کے سچے جذبات کے تحت بے بسوں کی بے بسی رفع کرنے، ضعیفوں کو اُبھارنے، بے کسوں کو سہارا دینے، ظالموں سے دبے ہوؤں کو اوٹھا دینے اور حدود سے گذر کر اوبھرے ہوؤں کو اُتار لانے اور بالفاظ دیگر اونچ نیچ کا فرق اُٹھا کر سب کو حقوق کے لحاظ سے مساوی سطح پر لے آنے کے ہیں۔ تاکہ ضعیف مظلوم نہ بننے پائے، اور قوی کو ظلم و زیادتی کا موقع نہ ملے۔ پس آزادی کا حاصل بلا روک ٹوک پُوری قوۃ و قدرت کے ساتھ ادائے حقوق نکل آتا ہے جس سے ظالم کے ہاتھ کٹ جائیں اور مظلوم کی بے دست و پائی ختم ہو جائے آزادی کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اسلام کا نصب العین دیکھیے تو وہ یہ ہے کہ:۔

ان فرعون علا فی الارض وجعل اهلها شیعا یستضعف طائفة منهم یذبح ابنأءهم ویستحیی نسأءهم انه کان من المفسدین ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلهم الوارثین ونمکن لهم فی الارض ونری فرعون وهامان وجنودهما منهم کانوا یحذرون۔

"فرعون زمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اُس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قسمیں (پارٹیاں) کر رکھا تھا کہ اُن میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا اُن کے بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور اُن کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ واقعی وہ بڑا مفسد تھا۔ اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین میں زور گھٹایا جا رہا تھا ہم اُن پر احسان کریں اور اُن کو پیشوا بنا دیں اور ان کو مالک بنا دیں۔ اور اُن کو زمین میں حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور اُن کے اہالی و موالی کو (زوال قوۃ و شوکت کے) وہ واقعات دکھلا دیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے۔"

اِس کا حاصل وہی نکلا کہ ضعیفوں کو اُبھارا جائے اور ظلم پسند زور آوروں کو گرایا جائے۔ ضعیفوں کے جو حقوق طاقتوروں نے زور و قوۃ کے بل بوتے پر سلب کر رکھے تھے وہ اُن کے دانتوں کے نیچے سے نکلوائے جائیں اور ضعیفوں کو واپس کئے جائیں تاکہ کمزور آزادی کا سانس لے سکے اور وقت کے فرعون و ہامان اپنی اصلی حد پر آجائیں ورنہ ختم ہو جائیں اگر آزادی کے یہی معنی ہیں اور شوکت و قوۃ کا یہی مقصد ہے (اور بلاشبہ یہی ہے نہ کہ فراعنۂ وقت کے وہ نفسانی مقاصد جس کے عنوانات کی فہرست ابھی سطور بالا میں گذری) تو پھر اسلام کے سوا کون ہے جو اس مقصد کو دیانت و اخلاق کے ساتھ دُنیا میں لیکر آیا ہو۔؟

اِس سے انکار نہیں کہ دُنیا کی کسی ملت نے بھی غلامی کا پروگرام اپنے افراد کو نہیں دیا لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آزادی کے نعشر کے بعد حقیقی آزادی کے مکمل پروگرام پیش کرنے کی بھی کسی ملت نے زحمت نہیں اوٹھائی۔ پس ملتوں کے دعوے کچھ بھی ہوں لیکن اُن کے پاس آزادی کا وہ جامع پروگرام ہی موجود نہیں جس سے آزادی کا ذکر کردہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اسلام نے اگر ایسی آزادی کا دعویٰ کیا ہے تو اُس کے عین مطابق عملی اور اخلاقی پروگرام بھی سامنے رکھا ہے۔ اِس لئے دعوائے آزادی میں اُسی کو سچا مدعی کہا جائیگا جو دعوے کے ساتھ عملی ثبوت بھی پیش کرے۔

آزادیٔ ضمیر

اگر غور کیا جائے تو حقیقی آزادی وہی ہو سکتی ہے جس میں بے جا دباؤ سے کلیۃً چھٹکارا میسر ہو اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے انسان کا دل و دماغ اور ضمیر آزاد ہو ضمیر کی آواز اور رائے آزاد ہو۔ عقل و فہم اور شعور و ادراک آزاد ہوں تاکہ جو کچھ وہ سمجھے خود اپنی بصیرت سے سمجھے دوسرے کے دباؤ اور جبر و قہر سے نہ سمجھے اور پھر جو کچھ اس سمجھے ہوئے کے مطابق عملدرآمد کرے وہ اُسی کا عملدرآمد کہلائے۔ انسان کی ساری آزادیوں کے سلسلے اسی باطن انسان سے چلتے ہیں یہ آزاد ہے تو اُس کی پوری دُنیا آزاد ہے، ورنہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہے اور اُس کی پوری دُنیا غلام ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ زور انسان کے باطن کی آزادی پر صرف کیا ہے اور اُس کے عقل و فہم کو اس حد تک آزادی بخشی ہے کہ خود اسلام کے منوانے میں بھی اُس کے باطن پر کسی خارجی اثر کا دباؤ ڈالنا گوارا نہیں کیا۔ مادی طاقتیں تو بجائے خود ہیں۔

معجزہ جو خدا کا فعل ہے اور جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اُسے بھی دلیل نبوۃ تو ٹھیرایا ہے لیکن دلیل صداقت مسائل نہیں بنایا۔ کیوں کہ مسائل کی حقانیت استدلال اور حجۃ و برہان سے واضح ہوتی ہے، خوارق سے ظاہر نہیں ہو سکتی بغیر حجۃ و دلیل محض خوارق کے زور سے کسی چیز کو منوانا طاقت کے زور سے منوانا ہے جسے اکراہ و اجبار کہا جاتا ہے جس سے مسئلہ کی حقیقت واضح نہیں ہو سکتی کہ اُس کے رد و قبول کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ نماز اور زکوٰۃ حق ہے، حج اور روزہ ضروری ہے۔ نکاح و طلاق کا فلاں طریقہ صحیح ہے بیع و شراء کا فلاں ڈھنگ درست ہے اور فلاں ناجائز۔ امن و جنگ کے یہ اوقات و مواقع مناسب ہیں اور وہ مناسب نہیں، اور دلیل یہ بیان کرے کہ میں آنکھ کے اشارے سے بلڈنگیں منہدم کر سکتا ہوں یا میں مُردے زندہ کر سکتا ہوں یا میں پرندوں کی بولیاں سمجھتا ہوں، تو ظاہر ہے کہ ان خوارق سے اُس کی معنوی قوت ضرور کھل جائے گی مگر مسائل کی معقولیت اور غیر معقولیت کا اس سے فیصلہ نہ ہوگا۔ کیا ضروری ہے کہ دیواروں کے انہدام، احیاء موتیٰ اور منطق الطیر کے سمجھ لینے سے مسئلہ میں معقولیت بھی آجائے۔ ظاہر ہے کہ محض دیوار گرا دینے سے کسی مسئلہ کو منوانا عقل پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ بلا دلیل مسئلہ کو تسلیم کر لے کیونکہ مسئلہ کی معقولیت کا تعلق دلیل سے ہے نہ کہ خوارق سے۔ ظہور خوارق سے پیغمبر کا منجانب اللہ تو ضرور واضح ہو جائے لیکن یہ ضروری نہیں کہ پیغمبر کے لائے ہوئے مسائل کی معقولیت بھی ان خوارق سے ذہن میں آجائے بلکہ اُن کا معقول اور موافق فطرۃ ہونا دلائل سے واضح ہوگا معجزات سے نمایاں نہ ہوگا۔ پس اگر خوارق ہی سے مسائل کی معقولیت کو بھی زبردستی منوایا جاتا۔

آزادیٔ عقل و فہم

اور عقلی بصیرۃ کو استدلال کی راہ سے گذر کر مسئلہ کی معقولیت تک پہونچنے کی اجازت نہ دی جاتی تو بلاشبہ یہ عقل پر ایک بے جا دباؤ ہوتا جس سے عقل کی آزادی میں فرق آجاتا درحالیکہ اسلام نے عقل کو آزادانہ سوچ بچار کرنے کا موقعہ دیا ہے۔ اس لئے خوارق کو نبی کی نبوۃ کی دلیل تو کہا گیا لیکن مسائل کی معقولیت سمجھنے کے لئے انھیں دلیل نہیں ٹھیرایا گیا۔ بلکہ اُس کے لئے کسی کے مبعوث من اللہ اور فرستادہ خدا ہونے کے لئے معجزہ اور خرق عادۃ ہی بہترین دلیل بن سکتا تھا۔ حجۃ و برہان اور فراستہ و وجدان کا راستہ کھولا گیا کہ مسائل کی صداقت تولنے کے لئے یہی حقیقی ترازو اور قسطاس مستقیم ہے۔ چنانچہ قرآن نے ایک ماننے والے کا پاکیزہ وصف یہ نہیں بیان کیا کہ وہ محض کسی قوۃ یا محض معجزہ اور خوارق کے دباؤ سے مسائل کو تسلیم کرتا ہے خواہ اُسے غیر معقول بھی جانتا ہو۔ بلکہ یہ بیان

کہا گیا کہ :-

والّذین اذا ذکروا بآیات ربھم لم یخرّوا علیھا صمًّا وعمیانًا۔

"اور (وہ مومن بندے) ایسے ہیں کہ جب اُن کو اللہ کے احکام کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو اُن پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ عقل و فہم کیساتھ) متوجہ ہوتے ہیں۔ تاکہ ماننے کے ساتھ اُن کا سمجھ لینا بھی ساتھ رہے"

پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہدینے کا ارشاد ہوا کہ :-

قل ھٰذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ۔ علےٰ بصیرۃٍ انا ومن اتبعنی وسبحان اللہ وما انا من المشرکین۔

"آپ فرما دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے، میں خدا کی طرف اس طور سے بُلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں (کہ کسی آبائی رواج پر پچھلوں کی ریت کو بے دلیل ماننے اور منوانے جاؤں)"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اپنی صداقت اور معبوث من اللہ ہونے کی دلیل میں بردوسلام کا معجزہ پیش کیا وہاں خدا کی توحید منوانے کے لئے بجائے خرق عادۃ کے نمرود سے استدلالی بحث و مناظرہ فرمایا جو حجت و بُرہان کی لائن تھی کسی معجزہ سے اُسے چُپ کرنے کی سعی نہیں فرمائی۔ موسیٰ علیہ السلام نے جہاں عصاء اور ید بیضاء کے چمکتے ہوئے خوارق عادۃ نشان پیش کئے تاکہ اُن کا پیغمبر ہونا واضح ہوجائے، وہاں مسائل سمجھانے کے لئے کسی معجزے کو استعمال نہیں کیا۔ بلکہ فرعون سے مکالمہ حجۃ و بُرہان سے کیا جس کی تفاصیل قرآن حکیم میں محفوظ ہیں۔

ٹھیک اسی عنوان پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہزارہا معجزات دکھلائے ہیں وہاں مسائل کے باب میں صرف ایک ہی معجزہ پیش کیا اور وہ قرآن تھا جو حجت و بُرہان اور عقلی و حسّی طرق استدلال سے بھرپور ہے پس آپ کو بوجہ خاتم النبیین ہونے کے طریق استدلال بھی معجزانہ ہی انداز کا دیا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ مسائل کا قابل فہم اور قابل سماعت ہونا فطری اور بدیہی دلائل سے واضح ہوتا ہے خوارق سے نہیں، خوارق اور معجزات کے زور سے مسائل کا منوانا ایک ایسا دباؤ ہوتا جس سے عقل و خرد کی آزادی سلب ہوجاتی اور انسان کو عقل اور فکر کا دینا نہ دینا برابر ہوجاتا۔

پس اسلام نے آزادی کا سبق باہر ہی باہر سے نہیں پڑھایا۔ بلکہ انسان کے اندرون کو سب سے پہلے آزادی کی دولت بخشی ہے۔ اُس کے ضمیر کو آزاد کیا۔ اُس کی عقل کو آزاد کیا، اُس کے فہم و فکر کو آزاد کیا۔ اور بالفاظ مختصر انسان کی حقیقت میں آزادی کا تخم بودیا اور اُسے مجسّم آزادی بنا دیا۔ بہر حال ضمیر کی آزادی اسلام کا پہلا قدم ہے جس کے اوپر سے اُس نے تمام خارجی اثرات حتیٰ کہ خدائی افعال (معجزات) تک کے دباؤ کو بھی باقی نہیں رکھا۔

آزادیٔ رائے

آزادیٔ ضمیر کے بعد ثانی الضمیر یعنی رائے کی آزادی کا مقام آتا ہے۔ اگر دیانۃً ضمیر ایک بات کو حق مان رہا ہے تو اُسے برملا اظہار کا حق دینا بھی اسلام ہی کی بلند حوصلہ فطرۃ کا کام تھا۔ ضمیر کی آواز اور دل کی مخلصانہ رائے ایک اپیل ہے جو بند رہنے کے لئے دل میں نہیں اُبھاری جاتی، بلکہ کھلنے اور کھل کر سامنے آنے کے لئے اُٹھائی جاتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی چیز کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ ضمیر کی آواز اور سچّے دل سے اُبھری ہوئی رائے کے اظہار پر کوئی پابندی عائد کردے۔ اُس کی تصدیق و تکذیب یا تصویب و تردید کا حجۃ کے ساتھ ہر ایک کو اختیار ہے۔ لیکن اوسے ادبھرنے نہ دینے کا کسی کو حق نہیں۔ اگر رائے کو آزاد نہ کہا جاتا تو ضمیر کی آزادی کے کوئی معنی نہ تھے۔ حتیٰ کہ ایک عام انسانی رائے پر پیغمبر کی رائے کو بھی رائے کی حیثیت سے اثر انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ کو ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت مغیث سے نکاح کا تعلق منقطع نہ کریں۔ بریرہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ امر ہے یا مشورہ؟ فرمایا نہیں مشورہ و رائے ہے۔ عرض کیا تو میں آزاد ہوں یہ رائے مانوں یا نہ مانوں۔ اور بالآخر نہیں مانیں۔ ایک طرف پیغمبر کی رائے ہے جو خاتم النبیین ہونے کے علاوہ اعقل الناس بھی ہیں، دوسری طرف ایک عورت کی رائے ہے جس کی جنس ناقص العقل شمار کی گئی ہے لیکن اسلام کی بخشی ہوئی آزادیٔ رائے کا مقام اس حد تک بلند ہے کہ ایک عورت کی رائے پر پیغمبر کی رائے کسی ادنےٰ دباؤ ڈالنے کی

مجاز نہیں ٹھیرائی گئی۔

بہر حال اسلام کی آزاد فطرۃ نے انسان کی آزادی کے لیے سب سے پہلے اوس کے باطن کو آزادی بخشی ہے۔ اُس کی عقل اوس کے ضمیر، اور اُس کی رائے کو آزاد رکھا ہے، اور اُس پر کسی ایسے دباؤ کو گوارا نہیں کیا جو اُس کے فطری اُبھار اور تقاضوں کو پامال کر دے۔

ظاہر ہے کہ جو اسلام انسانی باطن پر نبوۃ اور معجزات یعنی فعل نبوی اور فعل خداوندی کے دباؤ کو بھی برداشت نہیں کرتا تاوقتیکہ انسانی ضمیر خود ضمیری کے رُجحان اور اپنے ہی اندرونی دباؤ سے اُسے واجب القبول نہ سمجھ لے۔ تو وہی اسلام اُسی انسانی ضمیر اور بشری باطن پر اینٹ پتھر کے دباؤ، سونے چاندی اور زر و جواہر کی ڈھیریوں کے دباؤ، تیر و تفنگ اور بم و گیس کے دباؤ، کسی کی رسمی قربانی یا ہنگامی اقتدار کے دباؤ کو کب گوارا، اور برداشت کر سکتا ہے، اور تو اور وہ تو خود اپنے کو بھی نہ تلوار کے زور سے کسی کے اندر اُتارنا چاہتا ہے اور نہ کسی کو کسی قسم کے رسمی دباؤ سے اپنے اندر گھس آنے اور اُتر پڑنے کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ اُس نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ:۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی۔	"دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے"

پیغمبر صلعم کو ہدایت دی گئی کہ:۔

افانت تکرہ الناس حتیٰ یکونوا مؤمنین۔	"سو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں کہ وہ ایمان لے ہی آویں"

پس جو اسلام دین تک کے بارے میں دلوں اور ضمیروں کو آزادی بخش رہا ہے وہ رائے اور طبیعت کے اصلی تقاضوں کو کب پابند اور غلام رکھنا پسند کریگا؟ پس سب سے پہلے اسلام نے اندرونِ انسان ہی میں آزادی کا دیا روشن کیا، اور انسانی ضمیر انسانی رائے اور انسان کے دل کی آواز کو دل میں اُبھرنے اور اُبھر کر باہر نکلنے میں آزادی دی۔

ظاہر ہے کہ بیرونی آزادی اندرون ہی کی آزادی کے تابع ہوتی ہے۔ اگر ضمیر آزاد ہے تو اُس کا بیرونی ماحول بھی آزاد ہو کر رہتا ہے بشرطیکہ ضمیر میں واقعی حُریت و آزادی اُتری ہوئی ہو اور وہ ضمیر کی آواز بنی ہوئی ہو لفظی ترجمانی نہ ہو جس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔ پس آزادی ہو یا غلامی پہلے اندرونِ نفس میں آتی ہے پھر اُس کا بیرون آزاد یا غلام بنتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے بھی سائنٹیفک حقیقت وا شگاف فرما دی کہ:۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم۔	"واقعی اللہ تعالےٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں فرماتے جب تک وہ لوگ خود اپنے نفوس (کے اندرونی احوال) کو نہیں بدل دیتے"

پس باہر آزادی جب ہی نمایاں ہوتی ہے جب اندر آچکتی ہے، باہر انقلاب جب ہی رُونما ہوتا ہے جب اندر آلیتا ہے۔ باہر غلامی اُسی وقت آتی ہے جب نفوس کے اندر وہ سرایت کر چکتی ہے۔

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اُسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اُسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی۔ اِس لیے اسلام نے باہر آزادی کی فضاء پیدا کرنے کے لیے پہلے اندرونِ انسان میں آزادی اور جرأت کی فضاء پیدا کی تاکہ اُسی جرأت و بے باکی سے اُس کی بیرونی آزادی بھی فضاء پر محیط ہو جائے، اور اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں بلکہ باطنی اور بُنیادی آزادی و حریت کا منادی ہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی، دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے!

پس باطن میں تو اسلامی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا باطن اور ضمیر ہر ماسوی سے آزاد ہو کر حق کا پابند ہو جائے، ہر غیر اللہ کی حکمرانی اور قہرمانی سے آزاد ہو کر حق کی حکمرانی کے نیچے آجائے۔ اگر یہ اختیارِ حق اور ردِ باطل ضمیر کا جوہر بن چکا ہے جو حقیقی آزادی کا ما حصل ہے، تو ایسے ضمیر سے اسی قسم کی آزادی باہر بھی پھیلے گی۔ پرستارانِ حق کا غلبہ ہو جائے گا، اور پرستارانِ باطل کی شکست، صدیقوں اور صالحوں کی روش پھیل جائے گی، اور فرعونوں اور ہامانوں کے طور طریقے مسدود ہو جائیں گے۔ لیکن اگر حق سے آزاد ہو کر نفس کی پیروی اور غیر اللہ کے دباؤ کے آثار سے دل اور ضمیر شکست کھا چکا ہو یعنی ضمیر خود اپنے سے مطمئن نہیں بلکہ بیرونی اثرات سے متأثر اور اپنی موت سے خود ہی خجل ہے، گویا حق سے آزاد اور باطل کا غلام ہے (جو اسلامی آزادی کی ضد ہے) تو اُس نوع کی آزادی باہر بھی نمایاں ہوگی۔ فرعون و ہامان برسرِ اقتدار ہوں گے، صلحاء و صدیقین بے یار و مددگار بن جائیں گے

اور یہ آزادی یقیناً عالم کی آبادی نہ ہوگی بلکہ بربادی ہوگی جس کو احادیث صحیحہ میں علاماتِ قیامت (جن کا دوسرا نام فتن ہے جو اقوامِ عالم اور عالم کے لئے بمنزلہ سمِ قاتل کا حکم رکھتے ہیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے علاماتِ قیامت دریافت کیں تو آپ نے فرمایا:۔

ان تلد الامۃ ربتہا وان تری الحفاۃ العراۃ رعاء الشاء یتطاولون فی البنیان

"(قیامت اور عالم کی تباہی اُس وقت قریب ہوگی جب) باندی اپنی مالک کو جننے لگے یعنی لڑکیاں تک ماں پر حکومت کرنے لگیں جو لڑکوں سے کہیں زیادہ ماں کی مطیع ہوتی ہیں (یہ تباہی ہے معیشتِ منزلی کی) (اور سیاستِ مُدن یعنی مُلکی معاملات کی بربادی کی صورت یہ ہے کہ) تُم دیکھو کہ ننگے پیرے ننگے سرے ذلیل قسم کے لوگ) بکریاں چرانے والے (یعنی کمینہ قسم کے لوگ اونچی اونچی بلڈنگوں میں شیخیاں مارنے لگیں"۔

یعنی کمینے برسرِ اقتدار آجائیں اور حکمت پسند شرعاً جوتیاں چٹخاتے نظر آئیں۔ تو یہ اقتدار بظاہر آزادی ہوگا۔ مگر بنگاہِ غور ذلیل قسم کی غُلامی ہوگا جو غلامئ حق کے بجائے غلامئ نفس کی دلدل میں پھنسا کر انجام کار عام تباہی کی طرف قوموں کو دھکیل دے گا۔ بہرحال اسلام کی نگاہ میں آزادئ باطن کے معنی ضمیر کی آزادی۔ عقل و خرد اور فہم و فکر کی آزادی ہے جس سے انسان بذاتِ خود اپنے ضمیر کی آواز اُٹھانے میں جری' اور بے باک ہوجائے۔ اور آزادئ ظاہر کے معنی ضمیر کی اس آواز کے مطابق عملی اقدام میں ایسی جرأت اور قوت پیدا ہوجانا ہے جو امرِ حق کے نافذ کرنے میں کسی پس و پیش کی شکار نہ ہو اور انسان کو نہ لومۃ لائم کی پرواہ ہے نہ نصح ناصح کی۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں، کہ اسلام آزادی لے کر ہی نہیں آیا بلکہ آزادی کا مفہوم سمجھانے کے لئے بھی آیا ہے۔ اسلام ظواہر ہی کو آزاد کرانے نہیں آیا' بلکہ بواطن اور ضمائر کو بھی آزادی بخشنے کے لئے آیا ہے۔ اسلام نے آزادی کے معنی سمجھاتے ہوئے پہلے غلامی کے معنی سمجھائے ہیں کہ وہ نفس و شیطان کی پیروی کا ایک مختصر عنوان ہے۔ خواہ کوئی فرد اس پیروی کا شکار ہو یا جماعت۔ پھر اسی منفی پہلو سے آزادی کے معنی سمجھائے کہ وہ حق کی غُلامی کا دوسرا نام ہے' پس اس نظریہ پر جو حق کا غُلام ہوا وہی آزاد ہوا' اور جو اُس سے آزاد ہوا وہی غُلام ہوا۔ اس سے واضح ہوا کہ آزادی کے معنی اسلام میں شترِ بے مہار ہونے کے نہیں بلکہ بحجت و بُرہان سے پابندِ حق بنجانے کے ہیں۔

آج کے دور میں کوئی بھی قوم یا مُلک اگر آزاد ہو تو اُس کی آزادی اور غُلامی کا فیصلہ اسی اُصول سے کیا جائے گا کہ اگر وہ آزادی کے بعد اپنے ضمیر کی سیدھی سچی آواز کے تحت مخلوقِ خُدا سے اونچ نیچ اٹھانے میں بے باک ہے' اُسے ضعیف کو قوی کرنے اور اُس کے حقوق واپس دِلانے اور زور آور ظالم کے پنجۂ استبداد کو توڑ کر اُس سے غصب کردہ حقوق نکال لینے میں کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ سدِّ راہ نہیں ہوتی تو وہ آزاد ہے ورنہ قطعاً غلام ہے۔ اگر اتفاق سے کسی غیر کا نہیں' تو اپنے ذلیل نفس اور اُس کی ہوا و ہوس کا غُلام ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہی اندرونی غلامی چند ہی دن میں بیرونی غلامی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس لئے وہ ظاہری آزادی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر آزاد شدہ مُلک کا ضمیر آزاد ہے اور اُس کے عدل و مساوات کا سچا جذبہ اور اس پاکیزہ جذبہ کے بے لاگ اقدامات کسی بیرونی دباؤ کو نہیں مانتے اور کسی ملامت سے متأثر نہیں ہوتے تا آنکہ اس راہ عدل و مساوات میں قومیت' رنگ نسل' وطن' ہوسِ زر' ہوائے اقتدار اور غلط قسم کا ماحول کوئی بھی اُس کے جذبہ و عمل میں خلل انداز نہیں ہوتا تو وہ مُلک آزاد اور وہ قوم آزادی سے بہرہ مند ہے اور بلاشُبہ ضمیر کی یہ آزادی باہر کی اس آزادی کو زیادہ سے زیادہ مضبوط۔ زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ سے زیادہ دیرپا بناتی رہے گی۔ پس حقیقی آزادی وہی ہوگی جس میں ظاہر و باطن یکساں طریق پر آزاد ہوں' اس کے برعکس مقابلہ نہ ہو کہ ظاہر بظاہر آزاد ہو' اور دلوں میں غلامی کا چور نقب زنی کر رہا ہو۔ یا زبانی حقیقی آزادی کے ادعاء میں رطب اللسان ہوں مگر دلوں میں اُس کے برعکس جذبات کا طوفان بپا ہو۔ یرضونکم بافواھھم وتابٰی قلوبھم واکثرھم فاسقون

اسلام بھی جامع آزادی لیکر دُنیا میں آیا' اور جونہی اُس نے آزادی کا یہ غلغلہ بلند کیا اور اس کی آواز پر پاک ضمیر انسانوں نے اپنے ضمیر کی آواز سے لبیک کہا

وہ نہی پسماندہ اوبھر پڑے۔ پست بلند ہو گئے اور بلند نیچے کی طرف آ گئے غلام اور آقا دار میں فرق نہ رہا۔ یتیم بے کسی کا لبادہ اُتار کر ناز و نعم کے خلعت جاں بخش میں آگیا۔ مظلوم کی فریادیں عرش سے ٹکرانے لگیں، صنف نازک باندیوں سے حُرّہ ہو گئیں، بے کس اور لاوارث دوسروں کے مورث بن گئے، جنھیں سونے کے لئے فرشِ خاک بھی مشکل سے میسّر آتا تھا وہ کتان کے رومالوں سے ناک صاف کرنے لگے، اور جو خود ہل کر اپنی خدمت کرنا بھی عار جانتے تھے وہ خادم خلق اللہ بن گئے۔ غرض اسلام نے آزادی سے جو انقلاب برپا کیا وہ اونچ نیچ، اور من و تو کے امتیاز کا انقلاب نہ تھا بلکہ اونچ نیچ مٹانے اور من و تو قصے ختم کرنے کا انقلاب تھا۔ قانونی مساوات۔ تعلیمی یکسانی۔ مالی توازن جاہی ہمرنگی۔ امیر و غریب کے سنگم۔ اونچے اور نیچے کے ملاپ۔ آقا و غلام کی ہم آہنگی۔ شاہ و گدا کی یک منظری کا انقلاب تھا۔ جو اس کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ امیر و غریب، شاہ و گدا، اور اونچ نیچ افراد بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے کے سب مل کر کسی ایسی ذات کو دیکھنے لگیں جو اُن سب سے بالاتر ہے۔ اور اس طرح اُن کا رُخ ایک دوسرے کی طرف ہونے کے بجائے صرف ایک مرکز کی طرف ہو جائے جو واحد و قیوم ہو۔

پس اسلام نے آزادی اور آزاد روشی کی یہ حقیقت جس میں مساوات کے ساتھ ایک دوسرے کی خدمت بلکہ فدویت کا جذبہ کارفرما تھا، خود انسان کے نفس کی عظمت یا اصطلاحی خودداری سے نہیں اُبھاری، بلکہ ہر ہر نفس کی مخفی عظمت کو مٹا کر حق کی عظمت دل میں سمو کر پیدا کی۔ اس لئے اسلامی آزادی کے معنی غلامیٔ نفس، یا غلامیٔ غیر اللہ کے نہیں بلکہ غلامیٔ حق کے ہیں۔ پس آزادی کا لفظ تو اسلام اور غیر اسلام میں مشترک ہے لیکن اُس کے معنی اسلام اور غیر اسلام میں ایک دوسرے سے بالکل جُدا اور باہم بعید تر ہیں۔

"اسلام اور آزادی" کا عنوان جب سامنے آئے تو اس تفصیل کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے تاکہ دوسروں کی لفظی آزادی سے اسلام کی حقیقی آزادی متمیّز ہو سکے +